''ستی''...... ہندومت میں بیوہ عورتوں پر مذہب اور سماج کے نام پر ہونے والی رسم کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

حافظ محمد ثانی
شعبہ قرآن وسنہ
وفاقی اردو یونیورسٹی

عابدہ پروین
شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ کراچی

تلخیص

زیرنظر مقالہ میں بچوں سے متعلق اشتہاریات کے اثرات کے حوالے سے منتخب اشتہارات کے نمونے کی مدد سے یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے بچوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اشتہار، اشتہار کنندہ کی جانب سے ایک ایسا با معاوضہ پیغام کو کہا جاتا ہے جس میں کسی شے، خدمت یا خیال کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے اشتہار و خدمات کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے اور مطلوبہ ماحول پروان چڑھا کر مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ صارفین ذرائع ابلاغ میں سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ماؤں کی گود میں پروان چڑھنے والے بچے اشتہار کی مدد سے بڑوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور والدین سے زیادہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور جسمانی اور ذہنی طور پر زیادہ حساس بھی ہوتے ہیں۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کی اس طرح تربیت کریں کہ بچے اشتہاریات کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکیں اور بچوں کے مستقبل پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں۔ اس مقالے میں ٹی وی کمرشل کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا ان کو جانچا اور پرکھا جائے گا اسلام نے بچوں کے حوالے سے جو ذمہ داری تفویض کی ہیں اس کو بھی دیکھا جائے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اخلاقیات کا ایک ضابطہ متعین کیا ہے۔ جس پر کاربند ہوکر والدین بچوں کی اچھی تربیت اور نشوونما کر سکتے ہیں۔

Abstract

Hinduism Tradition of Sati - burning of a wife on the fire after her husband's death. Its historical and critical review. The custom of Sati has gained a peculiar notoriety with reference to Hindu Society and Hinduism in the civilizations and cultural system of the world and in world religions. There is a fundamental importance of various customs and rituals in Hinduism. The customs and ceremonies of Hindu civilization, culture and their religious values and teachings the part of them. In these rituals, Sati is also a ritual which has been

practiced from a long time, having the certification from religion in Hindu social system. It has been existing in the Hindu Civilization and social system for centuries. Widows, with the name of Sati, have been putting themselves on the pyres of husband in fire, after their death. This research based article is written after making a thorough study of the books of Hindu religion, its history, books and literature written on custom observing in society. It presents its reasons and causes of historical view, critically besides its historical background. It opens up the causes and reasons of this human's ritual from its start to practice and its evolution in the Hindu Social System.

''ستی'' کی رسم کو ہندو معاشرت اور ہندو سماج میں بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے، اس کے معنی پاک ہونے کے ہیں، ہندو رسم ورواج کے مطابق جو عورت شوہر کی موت کے بعد اس کی چتا پر جلتی تھی، وہ گویا پاک باز اور باعفت سمجھی جاتی تھی۔(۱)

ہندی اردو لغت کے مؤلف راجہ راجیسور راؤ اصغر ''ستی'' کے تحت لکھتے ہیں: ''سچا، کامل۔راست۔درست۔ نیک۔وفادار۔غیر متلون۔زن پارسا۔عاصمہ۔

''ست''، یعنی سچ پر قربان ہونے والی اور نیکی کے لیے جان دینے والی عورت۔یعنی وہ عورت جو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ فنا فی النار ہو جائے۔واضح رہے کہ عوام ''ستّی'' تشدید کے ساتھ کہتے اور پڑھتے ہیں۔(۲) ''ستی'' کی اصل ہندو دیوی ''ستی'' ہے، جسے وکشاینی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

''ارتھ وید'' کے مطابق ''ستی'' ایک قدیم رسم ہے، جب کہ ''رگ وید'' اس بارے میں یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ''ویدک'' عہد میں صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا تھا کہ بیوہ جلنے سے پہلے صرف ایک لمحے کے لیے اپنے شوہر کی چتا پر لیٹ جائے۔(۳)

چناں چہ ویدک عہد سے ۳۰۰ قبل مسیح تک ہندو سماج میں بیوہ عورتوں کا مقام قدرے اطمینان بخش تھا۔''ستی'' کا رواج اس دور تک مدہم ہو گیا تھا۔اگر چہ کہیں کہیں ویدک دور میں بھی اس کے باقی رہنے کے شواہد ملتے ہیں۔تاہم رگ وید اور اوستا کی مجموعی شہادت کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریہ ''ہندو ایرانی'' عہد میں اس رسم کو تیاگ چکے تھے، چناں چہ اپنے آپ کو جنگی نقطۂ نظر سے زیادہ مضبوط و مسلح کرنے اور نسل کے فروغ کے لیے انہوں نے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والی بیواؤں کو موت کے منہ سے نکال کر نئی زندگی کی روشنی میں لا کھڑا کیا اور انہیں دوبارہ باحیثیت و اولاد والی زندگی گزارنے کی سہولت فراہم کی۔ہندوستانی تہذیب کے مختلف ادوار تیتریہ، آرنیک، رگ وید

اور آخری دور کے ویدک لٹریچر میں مذکورہ بیان سے یہ واضح ہے کہ ویدک عہد میں بیوہ عورتیں اپنے شوہر کی لاش\چتا کے پہلو میں لیٹتی تھیں، اس کے بعد انہیں پھر سے زندگی کی دنیا میں لوٹ آنے کا پیغام دیا جاتا تھا۔(۴)

''مہابھارت'' کے مطابق ''ستی'' کی تاریخ ہندومت کے قدیم آریائی تمدن سے وابستہ ہے، اس دور میں مردے کے ساتھ اس کی بیواؤں اور دیگر محبوب اشیاء کو بھی دفن یا جلا دیا کرتے تھے، ایک روایت کے مطابق پاروتی شیو کی بیوی کا اوتار اختیار کرنے سے پہلے ایک ہندو درویش داناوکش کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی، جس کا نام ''ستی'' تھا آخر ایک وقت ایسا آیا وہ عظیم دیوتا کی بیوی بن گئی، جب اس کے باپ اور اس کے الوہی شوہر کے درمیان جھگڑا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو قربانی کی آگ میں شعلوں کی نذر کر دیا۔ اسی طرح ''مہابھارت'' کے مرکزی کردار پانڈو کی بیوی مدری کے بارے میں ہے کہ جب پانڈو کی موت واقع ہوگئی تو مدری نے اپنے جڑواں بچے کنتھی (پانڈو کی دوسری بیوی) کے سپرد کر دیے اور خود اپنے شوہر کے ساتھ جل گئی۔(۵)

ہندوستان میں ''ستی'' کی رسم کو بہت اہمیت حاصل تھا، ہیروڈوٹس (HERODOTUS) نے اسے قدیم سیتھین (Scythians) اور ترا کی (Thractcans) کی تہذیب کی روایت قرار دیا۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے اس تہذیب سے وابستہ افراد کی بیویاں اپنے شوہروں کی قبروں پر جان دینے کو باعث فخر سمجھتی تھیں۔ احتمال یہی ہے کہ یہ رسم دنیا بھر میں قدیم زمانہ کے اس قیاس سے چلی آتی ہے کہ شہزادوں اور امراء کی ایک یا دو بیویاں ان کی داشتائیں ان کے غلام ان کے مرنے کے بعد ان کی خدمت کرنا جاری رکھیں گے۔(۶)

چناں چہ قدیم چین میں شہنشاہ کی موت پر اس کی محبوب کنیزیں اس کے مقبرہ میں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں، تاکہ اگلے جہاں میں بھی وہ ان کے حسن و جمال سے قلبی سکون حاصل کر سکیں۔(۷) اس رسم کی تاریخ بہت قدیم دور سے ملتی ہے۔(۸)

"The Position of Women in Hindu civilization" کے مصنف مشہور ہندو محقق ڈاکٹر اے۔ ایس الٹیکر (Dr. A.S.Altekar) لکھتے ہیں:

> ''تاریخ قدیم سے مختلف اقوام میں یہ عقیدہ تھا کہ موت کے بعد کی زندگی دنیاوی زندگی کے مماثل ہے، لہٰذا ضروریات زندگی مردے کے لیے اگلے جہاں میں کم و بیش اسی طرح

ضروری ہیں جس طرح کہ موجودہ زندگی میں، لہٰذا میت کے ورثا کا یہ مذہبی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مردے کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس کی ضروریات اور خواہشات زندگی بہم پہنچائیں اور مردے کو ہر وہ شے مہیا کریں جس کی اسے زندگی میں ضرورت تھی۔ بطور خاص بادشاہوں اور حکمراں طبقہ کے افراد میں یہ تصور جاگزیں تھا کہ مردے کو بیوی، خادموں اور سواری کی ضرورت ہوگی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام چیزوں کو مردے کے ساتھ زندہ دفن کردیا جائے یا اس کے ساتھ جلا دیا جائے۔ اسی اعتقاد کی بنیاد پر ہندومت میں ''ستی'' بیوہ کے شوہر کے ساتھ زندہ سپرد آگ کرنے کا نظریہ وجود پزیر ہوا''۔(۹)

نظریۂ ستی کی ابتداء کی تاریخ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے ساتھ منسلک ہے، البتہ اس کا ارتقاء اور کثرت سے وقوع پزیری کا دور برطانوی راج کے عہد سے منسلک ہے۔(۱۰) ''ستی'' کی ابتدائی تاریخ ہندوستان میں آرین کی آمد کی تاریخ سے منسلک بیان کی جاتی ہے۔(۱۱)

بعض یونانی مورخین کے مطابق ''ستی'' کی رسم کا فروغ اور اس نظریہ کی اشاعت پنجاب کے کیتھاس عہد میں ہوا۔(۱۲) چوتھی صدی بعد مسیح میں ''ستی'' کی رسم مزید اشاعت پزیر ہوئی اور اس نظریے کو فروغ حاصل ہوا۔(۱۳) جب کہ چھٹی صدی عیسوی کے ایک قدیم کتبے سے بھانو گپت کے سپہ سالار گوپ راج کی بیوی کے ''ستی'' ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔(۱۴)

ساتویں صدی عیسوی میں ''نظریہ ستی'' کی خوب تشہیر کی گئی اور اس کے فروغ کے لیے بطور وکالت دلائل پیش کیے گئے۔ چناں چہ اس عہد میں یہ نظریہ فروغ پا گیا کہ ''ہندومت'' کی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل اگر کوئی تعلیم ہے تو اس میں سب سے زیادہ اہم ''ستی'' کی رسم ہے کہ بیوہ عورت ''ستی'' ہونے کے بعد اپنے شوہر کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور وہ دونوں (میاں بیوی) صرف اس عمل یعنی عورت کے ''ستی'' ہوجانے کی بناء پر ساڑھے تین کروڑ سال تک جنت میں رہیں گے۔ اسی طرح ایک مذہبی کہاوت مشہور تھی کہ جس طرح سپیرا بین (بانسری) بجا کر سانپ کو اس کے بل سے بانسری کے زور پر باہر نکال لاتا ہے، اسی طرح ''ستی'' ہونے والی عورت اپنے شوہر کو جہنم سے باہر نکال دے گی اور وہ دونوں جنت میں ساڑھے تین کروڑ سال تک رہیں گے۔(۱۵)

مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لیبان (Dr. Lebon) کے مطابق یہ رسم سن عیسوی سے قبل کی ہے، کیوں کہ یونانی مصنفون نے تین سو قبل مسیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱۶)

مہابھارت میں بار ہا ''ستی'' کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مہابھارت میں اس قانون کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ باوفا بیوہ اپنے شوہر کے بعد زندہ رہنے کے بجائے بڑے فخر اور ناز کے ساتھ اس کی چتا کی آگ میں کودنے کو ترجیح دیتی ہے۔(۱۷)

نامور مغربی مصنف وِل ڈیورانٹ کے مطابق ہند میں سکندر اعظم کی آمد تک ''ستی'' کی رسم جاری تھی۔ پنجاب کے قدیم کیتھاری قبیلے میں شوہروں کو بیویوں کے ہاتھوں زہر دے کر مارنے سے بچانے کے لیے ''ستی'' کو باقاعدہ قانون کی شکل دی گئی۔(۱۸) (گویا شوہر کی زندگی میں بھی ستی کی رسم کی ادائیگی کی مثالیں موجود تھیں)

برہمنوں نے ''ستی'' کو مذہبی رنگ دیتے ہوئے اسے یہ کہہ کر اپنا لیا کہ یہ دراصل شادی کی ابدیت سے وابستگی کا اظہار ہے۔ کسی مرد سے ایک مرتبہ بیاہی گئی عورت ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جاتی ہے اور اگلے جنموں میں بھی دونوں کا ملاپ ہوگا۔(۱۹)

''ستی'' کی رسم کا ارتقاء سماجی و معاشی حالات کے بدلنے کے ساتھ ہوا۔ ''ویدک'' دور میں اگرچہ کچھ شواہد ملتے ہیں کہ عورت شوہر کے ساتھ جل گئی لیکن اس وقت تک ''ستی'' ہونا علامتی سمجھا جاتا تھا اور یہ رسم آخری ویدک دور میں تھی، کیوں کہ اس وقت تک بیوہ عورتوں کی شادی ہو جاتی تھی، مگر ''گپت'' دور کے آتے آتے ''ستی'' کی رسم معاشرے کے اعلیٰ طبقہ میں رواج پا گئی اور ان کی تقلید میں دوسرے لوگ بھی اسے اختیار کر رہے تھے۔(۲۰)

''ستی'' کی پہلی یادگار ۵۱۰ء میں مدھیا پردیش کے شہر اران میں ملتی ہے۔ ''ستی'' کی رسم کے پس منظر میں عورت کی سماجی حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی اپنی ذات اور شناخت ختم ہو جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شوہر کی وفات کے بعد اس کے لیے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔(۲۱)

عورت کو شوہر کے مردہ جسم کے ہمراہ اور اس کے بغیر دونوں طرح ''ستی'' کرنے کا رواج تھا۔ اگر شوہر کی لاش مہیا ہو جاتی تو بیوی کو اس کے ہمراہ جلا دیا جاتا تھا۔ اسے ''سہہ مرن'' (بیوی کا اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ بخوشی و براضا و رغبت جل مرنا) یعنی ساتھ مرنا کہتے تھے، لیکن اگر شوہر بیوی سے دور مرتا یا بعض استثنائی حالات کے تحت مثلاً

بیوہ حاملہ ہوتی تو اسے بعد میں کسی ایسی چیز کے ساتھ جلایا جاتا جس کا تعلق اس کے شوہر کے ساتھ ہوتا تھا، جو اس کے شوہر کی نشانی ہوتی تھی، اس طرح جلنے کو''انومرن''(عورت کا اپنے مردہ شوہر کے ساتھ جل مرنا) یعنی قاعدے کے تحت مرنا کہتے تھے، ان اصطلاحات کو بالترتیب''سہہ گنا''یعنی ساتھ جانا اور''انوگنا''یعنی قاعدے کے مطابق جانا بھی کہتے ہیں۔

اگر کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں تو جلنے''ستی'' ہونے کا اعزاز سب سے بڑی بیوی کو ہوتا اور دیگر بیویاں الگ الگ جلائی جاتیں۔ غیر معمولی حالات میں ایسی بیویاں اپنی زندگی بھر کے اختلافات اور عداوت ختم کردیتی تھیں اور اسی آگ میں اپنے شوہر کے ساتھ جلنے کا انتظام کرلیتی تھیں۔(۲۲)

ابوالفضل نے''آئین اکبری''میں''ستی'' کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی ہیں:

(۱) اول وہ کہ جو شوہر کی موت کے غم میں بے ہوش ہوجاتی اور اس کے رشتے دار اسے آگ میں جلادیتے۔

(۲) دوم وہ عورتیں جو شوہر سے بے انتہا محبت کرتیں اور خوشی خوشی جلنے پر تیار ہوجاتیں۔

(۳) سوم وہ قسم جس میں رسم ورواج کے بندھن کے تحت بیوہ عورتیں جل جاتیں اور کوئی مزاحمت نہیں کرتی تھیں۔

(۴) چہارم چوتھی وہ قسم ہے جس میں بیوہ عورت کو خاوند کے خاندان والے زبردستی جلادیتے۔(۲۳)

''ستی'' کی رسم کے اجراء اور اس کے فروغ میں مذہبی عنصر اور برہمن کی عیارانہ ترغیب کو بڑا دخل حاصل تھا۔ برہمن کے لیے بیوہ کے روبرو یہ بات بیان کرنے کا غیر معمولی مناسب موقع ہوتا تھا کہ زندگی قطعی ناپائیدار اور فریب پر مشتمل ہے اور یہ کہ دراصل حقیقی زندگی وہی ہے جو اس کے بعد شروع ہوگی۔ برہمن اسے یقین دلاتا تھا کہ ایک بار جلنے کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی اور اسے ہر طرح کی دولت، پوشاک، عزت، خوشی ناقابل بیان حد تک نصیب ہوگی۔ اس طرح بیوہ کو یقین ہوجاتا تھا کہ اس کا آگ میں''ستی'' ہونا اس کی شادی کے موقع سے بھی مبارک موقع ہے کیوں کہ اس کے بعد اسے اپنے شوہر کے ساتھ دائمی رفاقت ملے گی، لیکن اس نے اگر اس کے برخلاف کیا تو اس کا غیر مطمئن بھرت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ارواح خبیثہ میں شامل ہوجائے گا، لہٰذا بیوہ کے لیے سوائے ''ستی'' ہونے کے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔(۲۴۔الف)

قدیم ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ رائے نے اپنی بارہ میں سے تین ہزار من پسند

بیویوں کو صرف اس شرط پر منتخب کیا کہ وہ اس کی موت پر اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر اس کی چتا کی آگ اور اس کے دہکتے شعلوں کے حوالے کر دیں گی۔ جوان سب کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ (۲۴۔ب)

چناں چہ ساتویں صدی عیسوی میں ''ستی'' کی خوب تشہیر کی گئی کہ ستی ہونے والی عورت اپنے شوہر کو جہنم سے نکال لائے گی اور وہ دونوں جنت میں ساڑھے تین کروڑ سال تک رہیں گے۔ (۲۵)

فرانسیسی محقق ڈاکٹر لیبان (Dr. Lebon) لکھتے ہیں:

> ''جس وقت اس اعلیٰ اور عیش کی زندگی کا جو بیوہ کو عالم بالا میں اپنے شوہر کے ساتھ نصیب ہوگا، اس مصیبت اور ذلت کی زندگی سے موازنہ کیا جائے جو اسے بیوگی کے بعد ہندو سماج اور اس عالم میں کاٹنی پڑے گی تو بخوبی سمجھ میں آتا ہے کہ بے چاری ہندو بیوہ نہایت آمادگی اور جوش کے ساتھ اس طرح جان دینے پر راضی ہو جاتی تھی کہ اس کے گرد ایک مجمع جمع ہوتا تھا جو دعائیں پڑھتا اور گاتا ہوا ہندو بیوہ کو اگلے جہاں کے لیے شاباش اور مرحبا کے نعروں سے رخصت کرتا تھا''۔ (۲۶)

ڈاکٹر گستاؤلی بان مزید لکھتے ہیں:

> ''مذہبی اعتقادات جو صدیوں سے جاہل اقوام کی فطرتوں میں مستحکم ہو گئے اور وہ مصائب جن کا سامنا اس قبیح رسم کی وجہ سے ہر بیوہ کو کرنا پڑتا ہے ''ستی'' کے اصل اسباب ہیں۔ مذہب ہی وہ چیز ہے جو انسان سے اس قسم کے فدائی کام کراتا ہے۔ نہ صرف ہندو عورتیں بلکہ ہر زمانے کے مذہب پرست محض قوت اعتقاد سے جلتی ہوئی آگ میں اس امید سے کودے ہیں کہ ان کے آگے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ (۲۷)

"Hindu Manners, Costoms & Cermonies" کے مصنف فرانسیسی محقق دیوبائیس (A.J.A Dubois) جنھوں نے اپنی عمر کے چالیس برس محض ہندومت اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے مطالعہ و تحقیق پر صرف کیے، ہندوستانی سماج میں بیوہ عورت کے ''ستی'' ہونے کے مختلف اسباب میں ایک بنیادی سبب ہندو سماج میں ''بیوہ'' عورت کے مقام اور اس پر روا رکھے جانے والے مظالم کو قرار دیتا ہے۔ ان حالات میں ایک بیوہ

عورت ہندو دھرم کی تعلیمات کے مطابق زندہ رہنے سے شوہر کی چتا کے ساتھ ہی زندہ جل جانے، خودسوزی اور ''ستی'' ہوجانے کو ترجیح دیتی ہے۔(۲۸)

عام لوگوں کے لیے بیوہ کا ستی ہونا ایک تفریح کی حیثیت رکھتا تھا، جب کہ تجربہ کار ودوراندیش افراد ستی ہونے والی بیوہ کو دوسری دنیا میں جانے والے مقاصد کی حیثیت سے تصور کرتے تھے، وہ لوگ ''ستی'' کے ذریعے دوسری دنیا کے باشندوں کے نام ہر طرح کے پیغامات بھجواتے تھے۔(۲۹)

جب کہ چند دیگر سماجی امور بھی اس رسم کے اجراء اور تسلسل کے ذمے دار ہیں، ان میں ستی کی رسم کی ہمت افزائی کرنے میں ہندو سماج میں بیوہ کی گری ہوئی حالت کا بھی بہت زیادہ دخل ہے، ایسے ظاہری ثبوت ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''ستی'' کے ابتلاء سے فرار کی صورت میں اسے بہت تلخ اور شرمناک زندگی گزارنی پڑتی تھی۔اس لیے بیوہ یہی بہتر سمجھتی تھی کہ خود کو شعلوں کے سپرد کردے، اس کے ساتھ ہی کنبہ کے وقار کا مسئلہ بھی تھا۔رائے عامہ اور مذہبی اعتقادات یہ بات ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ ''ستی'' ہونا عورت کی اعلیٰ ترین اور انتہائی قابل تعریف صفت ہے۔اگر کوئی بیوہ اپنے متوفی شوہر کے ساتھ ''ستی'' نہیں ہوتی تو یہ اس کی وفاداری اور پاک بازی کی کمی کی دلیل تصور کیا جاتا تھا۔(۳۰)

ڈاکٹر گستاؤلی بان مسٹر ملاباری کے حوالے سے لکھتے ہیں:''ہندو کا مرنا اس کی بیوہ کے لیے ایسی مصیبت ہے جو ہر روز بڑھتی جاتی ہے۔وہ کبھی سر نہیں اٹھا سکتی اور تادم مرگ یہ مصیبت اس کے ساتھ رہتی ہے۔اس کا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا، وہ ان کی نظر میں منحوس سمجھی جاتی ہے اور جس چیز کو وہ ہاتھ لگاتی ہے، وہ نجس سمجھی جاتی ہے۔اس ذلت اور رسوائی کی زندگی کو وبال سمجھتے ہوئے اسے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے خیال کو پاک کردے یا ایک مصیبت اور تنہائی کی زندگی بسر کرے۔(۳۱)

بعض حالات میں ایسی عورت پر معاشی دباؤ بھی ڈالا جاتا تھا۔''نکولا کونٹی'' نے ایسے واقعات نقل کیے ہیں، جن میں بیوہ کو ''ستی'' ہونے، بصورت دیگر جہیز کو واپس کرنے کی شرط عائد کی گئی۔موخرالذکر حالت میں اس کے لیے اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمام ساز وسامان متوفی شوہر کے رشتے داروں کو دینا پڑتا تھا۔(۳۲)

مذکورہ اسباب اور نظریات کی بناء پر ''ستی'' کی رسم ہندومت میں فروغ پاتی گئی اور معاشرے میں اس کے

اثرات وسیع تر ہوتے گئے۔ سات سو سے گیارہ سو بعد مسیح تک ''ستی'' کی رسم ہندوستان کے دیگر علاقوں کے علاوہ شمالی ہند اور کشمیر میں بہت زیادہ فروغ پا چکی تھی اور اس دوران کشمیر کے حکمراں خاندانوں میں یہ مذموم رسم شدت کے ساتھ جاری رہی۔(۳۳)

ڈاکٹر لیبان ''ستی'' کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''اب سمجھ میں آئے گا کہ ہندو عورت کی محبت اور جاں نثاری شوہر کے ساتھ کس درجہ پر ہے اور چوں کہ یہ رسم صدیوں سے چلی آ رہی ہے، جاں نثاری عورت کی فطرت کا جزو بن چکی ہے، یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر ''ستی'' کی رسم قائم ہوئی اور قائم رہی اور جس رسم کی بناء پر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ جلنے پر مجبور ہیں''۔(۳۴)

ہندو بیوہ کا شوہر کی چِتا (لاش) کے ساتھ جلنے کا بیان بہت تکلیف دہ ہے اور اسے صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ شوہر کی ارتھی کے ساتھ پیچھے پیچھے چلتی تھی اور اسی کے ساتھ جلا دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں جلانے کا یہ عمل بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا تھا، اس کے لیے بڑی ہمت اور ضبط کی ضرورت تھی۔

مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ نے دونوں قسم کے واقعات کی تفصیل دی ہے:

ذیل میں ابن بطوطہ کے مشاہدے کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس میں ان تین ہندو بیواؤں کی ''ستی'' کا چشم دید بیان ہے، جن کے شوہر دور دراز مقام پر جنگ میں مارے گئے تھے۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے:

''جب تین بیواؤں نے ''ستی'' ہونے کا ارادہ کیا تو وہ پہلے تین دن گانے بجانے اور کھانے میں مشغول ہوگئیں، گویا دنیا سے رخصت ہونے کو تھیں۔ ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آتی تھیں اور چوتھے دن ان کے پاس ایک ایک گھوڑا لائے، ہر بیوہ بناؤ سنگھار اور خوشبو لگا کر اس پر سوار ہوئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا، جسے اچھالتی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں منہ دیکھتی جاتی تھی، برہمن ان کے گرد جمع تھے اور ان کے رشتے داران کے ساتھ ساتھ آگے آگے۔ نقارے اور نوبت بجتی تھی۔ ہر ایک ہندو اسے کہتا تھا میرا سلام میرے ماں باپ یا بھائی یا دوست کو کہنا۔ وہ کہتی اچھا اور ہنستی جاتی تھی۔ میں بھی اپنے دوستوں کو لے کر ان کے جلنے کی کیفیت دیکھنے گیا۔

ہم ان کے ساتھ تین کوس گئے اور ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی بکثرت تھا اور درختوں کے انبوہ سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ بیچ میں چار گنبد تھے ہر ایک گنبد میں ایک بت تھا اور گنبد کے بیچ میں پانی کا حوض تھا، ان پر درختوں کے سایے کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی، تاریکی میں یہ جگہ گویا جہنم کا ٹکڑا تھا۔ جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہنچیں تو حوض میں اتر کر انہوں نے غسل کیا، حوض میں غوطہ لگایا، اپنے کپڑے، زیورات اتار کر علیحدہ رکھ دیے اور ان کے بجائے ایک موٹی ساڑھی باندھ لی، حوض کے پاس ایک جگہ آگ دہکائی گئی اور جب اس پر سرسوں کا تیل ڈالا گیا تو وہ شعلے مارنے لگی۔ پندرہ ایک آدمیوں کے ہاتھ میں لکڑیوں کے گٹھے بندھے ہوئے تھے اور دس ایک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ نقارے اور نفیری والے بیوہ کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر لیا تھا، تا کہ عورتوں کی نظر اس پر نہ پڑے۔ ان میں سے ایک عورت نے رضائی کو زبردستی ان لوگوں کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہا! کیا میں جانتی نہیں کہ یہ آگ ہے۔ مجھے ڈراتے ہو۔ پھر اس نے آگ کی طرف ڈنڈوت کی اور اپنے تئیں ڈال دیا۔ اس وقت نقارے اور نفیریاں بجنی شروع ہوئیں اور لوگوں نے جو بہت سی لکڑیاں ہاتھ میں لیے ہوئے تھے، آگ میں ڈالنی شروع کر دیں، اس کے اوپر بڑے بڑے کندے ڈال دیے، تا کہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے، حاضرین نے بھی بہت شور کیا۔ میں یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا''۔(۳۵)

لیڈی ایمرسٹ نے اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ''ستی'' کے ایک دل خراش واقعے کا مشاہدہ کیا جسے اس نے اپنے روزنامچہ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے:

''ایک ہندو نوجوان ہیضہ سے مر گیا اور اس کی بیوہ نے اس کی چتا کے ساتھ جل مرنے ''ستی'' ہونے کا ارادہ کر لیا۔ ضروری کارروائیاں عمل میں آئیں، مجسٹریٹ سے لائسنس حاصل کر لیا گیا۔ چتا کو متوفی کے قریبی رشتے داروں نے آگ لگا دی، لیکن جب آگ کے شعلے بیوہ تک پہنچے، تو اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ دھویں کے بادلوں، ہجوم کے چیخ و پکار اور ڈھول نقاروں کی سمع خراش شور وغل کے درمیان کسی نہ کسی طرح چتا سے اتر آئی اور لوگوں سے نظر بچا کر ذرا فاصلے پر جنگل جا پہنچی۔ پہلے تو کسی کو اس کا خیال نہ آیا لیکن جب دھواں کم ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ چتا پر نہیں ہے، اس پر لوگ آپے سے باہر ہو گئے اور سب اس بدنصیب لڑکی کی تلاش میں جنگل کی طرف بھاگے۔ جنگل سے گھسیٹ کر اسے دریا کے کنارے لائے اور ایک ڈنگی میں ڈال کر منجھدار میں لے گئے، وہاں اسے زبردستی دریا میں

پھینک دیا، بے چاری کو ایک بار ڈوب کر پھر آنا نصیب نہیں ہوا''۔(۳۶)

''ستی'' کی ظالمانہ رسم اور اس کے پس منظر کے بارے میں ڈاکٹر فرانسس برنیئر نے اپنے ''سفر نامۂ ہند'' میں نے لکھا ہے:

''برہمن گائے کی دم کا بال بھی بیکا نہیں کرتے، لیکن ایک جیتے جاگتے انسان کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیتے ہیں۔ وہ عورت کو ''ستی'' کی ترغیب اس لیے دیتے تھے کہ اس کے جل مرنے کے بعد اس کے زیورات اور متروکہ سامان انہی کو ملتا تھا۔ بعض اوقات نوجوان بیوؤں کو ان کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر چتا پر لے جاتے تھے، جہاں انہیں رسیوں میں جکڑ دیا جاتا تھا کہ مبادا آگ سے گھبرا کر بھاگ جائیں۔ جو عورت کسی حیلے بہانے سے آگ میں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی، اسے ذات سے خارج کر کے چوہڑے چماروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا''۔(۳۷)

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلاطین دہلی نے ایک قانون وضع کیا تھا، جس کی رو سے حکومت کی حدود میں ایک بیوہ کو جلانے کے لیے اجازت نامہ لینا ضروری تھا۔ غالباً یہ قانون اس لیے وضع کیا گیا تھا کہ کسی عورت کو زبردستی یا سماج کے دباؤ کے ذریعے جلنے پر مجبور نہ کیا جا سکے۔ مغل شہنشاہ ہمایوں کے دور حکومت میں ''ستی'' کے ایسے تمام اقدامات پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کوئی بھی عورت جو بچہ پیدا کرنے کی عمر سے آگے نکل چکی ہو، ستی نہیں ہو سکتی تھی، خواہ وہ برضا ورغبت ہی خود کو ستی ہونے کے لیے پیش کیوں نہ کرے۔ یہ سماجی اصلاح کا بہت دلیرانہ اقدام تھا، ہندو مذہبی طبقہ اور عوام نے نہ اس کی شدید مخالفت کی اور نہ اس کے خلاف کوئی مظاہرہ ہوا، مگر ضعیف الاعتقاد بادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ دوسرے لوگوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی اور ایک مقدس رسم پر پابندی لگانے سے اس پر خدا کا قہر نازل ہوگا اور اس کی حکومت کو زوال ہوگا، شاید یہ اس کی اپنی موت کا باعث بھی بنے، ان امور کی بناء پر شہنشاہ کو اپنے سابقہ احکام منسوخ کرنے پڑے۔

بہرحال اس سلسلے میں عام احکام پر عمل ہوتا رہا، کیوں کہ بیوہ کو جلانے کے مواقع پر سلطان کے افسر ہمیشہ موجود رہتے تھے، تاکہ لوگ زبردستی نارضامند بیوہ کو جلنے ''ستی'' پر مجبور نہ کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر نے ''ستی'' کے چند مشہور واقعات میں بذات خود دخل اندازی کی تھی اور بیواؤں کو جلنے سے بچا لیا تھا۔(۳۸)

ہندوستان کا مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے:

''آج کل پہلے کی بہ نسبت ''ستی'' کی تعداد کم ہوگئی ہے، کیوں کہ مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں، اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے میں حتیٰ المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اگر چہ اس کے امتناع کے لیے کوئی قانون مقرر نہیں ہے، کیوں کہ ان کی پالیسی کا یہ جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کے معاملات میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے، بلکہ مذہبی رسوم کے بجالانے میں انہیں آزادی دیتے ہیں۔ تاہم ''ستی'' کی رسم ورواج کو بعض ایچ پیچ کے طریقوں سے روک دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت بلا اجازت صوبہ کے حاکم کے ''ستی'' نہیں ہوسکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ واقعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہوجاتا کہ وہ عورت ہرگز اپنے ارادے سے باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بیوہ کو بحث ومباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے، اگر اس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنے محل سرا میں بھیج دیتا ہے، تاکہ بیگمات بھی اسے اپنے طور پر سمجھائیں، مگر باوجود اس کے ''ستی'' کی تعداد اب بھی بہت ہے، خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے''۔(۳۹)

"The Position of Women in Hindo Civilization" کے مصنف ڈاکٹر اے ایس الٹیکر (Dr. A.S. Altekar) کے مطابق تیرہویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک ''ستی'' کی رسم کو تحفظ حاصل رہا اور ان ادوار میں ''ستی'' کا وقوع یقینی ہے، تاہم اس مخصوص عہد میں ''ستی'' کے بارے میں متعینہ اعداد وشمار کا حصول ایک ناممکن امر ہے اور یہ بھی ایک یقینی بات ہے کہ ہندو معاشرے میں راجپوتانہ میں ''ستی'' کے اعداد وشمار دس فیصد تک ملتے ہیں جب کہ مجموعی ہندو معاشرے میں ہزار میں ایک بیوہ عورت کے ''ستی'' ہونے کا وقوعہ، امرِ یقینی ہے۔ جب کہ اس امر کے بھی ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ عوامی اور سرکاری سطح پر اس مذموم رسم کے خاتمے کے لیے انیسویں صدی کے ربع اول تک (ماسوائے اسلامی عہد کے) کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے گئے۔ جب کہ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بمبئی اور مدراس میں اس کے اعداد وشمار پچاس سے اوپر ملتے ہیں۔ پونا میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۲ء تک سالانہ اعداد وشمار بارہ سے اوپر ملتے ہیں۔(۴۰)

برٹش گورنمنٹ کے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق ''ستی'' کی مذموم رسم سب سے زیادہ بنگال کے ہندو

طبقے میں رائج تھی اوراس کے واضح اعداد وشمار بنگال میں بکثرت ملتے ہیں۔ ذیل میں چند اعداد وشمار درج کیے جاتے ہیں۔

۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۸ء تک ''ستی'' کے اعداد وشمار

نام ڈویژن	اعداد وشمار (مجموعی تعداد)
کلکتہ ڈویژن	۵.۹۹
پٹنہ ڈویژن	۷.۹
بریلی ڈویژن	۱۹۳
بنارس ڈویژن	۱۱۶۵

مندرجہ بالا اعداد وشمار یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ بنگال میں ''ستی'' کی رسم ہندوؤں میں مروج تھی۔ اس سلسلے میں ''ستی'' کے خاتمے کے لیے سخت سے سخت اور موثر اقدامات بھی اس کے خاتمے کے لیے موثر نہ ہوسکے۔ (۴۱)

بنگال کے مختلف اضلاع میں ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۸ء تک ''ستی'' کے سالانہ اعداد وشمار

سن	اعداد وشمار (مجموعی تعداد)
۱۸۱۵ء	۳۷۸
۱۸۱۶ء	۴۴۲
۱۸۱۷ء	۷۰۷
۱۸۱۸ء	۸۳۹
۱۸۱۹ء	۶۵۰

۱۸۲۰ء	۵۹۸
۱۸۲۱ء	۶۵۴
۱۸۲۲ء	۵۸۳
۱۸۲۳ء	۵۷۵
۱۸۲۴ء	۵۷۲
۱۸۲۵ء	۶۳۹
۱۸۲۶ء	۵۱۸
۱۸۲۷ء	۵۱۷
۱۸۲۸ء	۴۶۳

مندرجہ بالا جائزے میں بنگال کے علاوہ یوپی، بہار، اڑیسہ اور آسام کے اعداد وشمار بھی شامل ہیں۔(۴۲) جب کہ بمبئی اور اس میں ’’ستی‘‘ کے اعداد وشمار بنگال کے مقابلے میں تقریباً نصف ملتے ہیں۔

مسلم حکمرانوں کی طویل جدوجہد اور ستی کی رسم کو باقی رکھنے کے لیے ہندومت کے مذہبی طبقے کے شدید احتجاج کے باوجود بالآخر لارڈ ولیم بینٹنگ نے ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو ’’انسدادِ ستی‘‘ کا قانون منظور کرلیا۔اس قانون کی منظوری میں بنگال کے معروف سماجی رہنما راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲۔۱۸۳۳ء) کی انسدادِ ستی تحریک نے کلیدی کردار ادا کیا۔اس کی رو سے بیوہ کو جلانا اور زندہ دفن کرنا (یعنی ستی کی ہر صورت) خلاف قانون اور اسے فوجداری عدالتوں میں قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔(۴۳)

’’ستی‘‘ کے خاتمے اور اس کے خلاف عملی اقدامات کے سلسلے میں سب سے پہلے ریاست جے پور نے پہل کی۔(۴۴) تاہم فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان کے مطابق برٹش گورنمنٹ کی جانب سے ’’ستی‘‘ کی ممانعت کے قانون کے نفاذ کے بعد اس ممانعت اور قانون کی مخالفت عورتوں کی طرف سے ہوئی اور ایک مدت تک وہ خفیہ طور پر

اپنی جانیں قربان کرتی رہیں۔(۴۵)

گستاوَلی بان مزید لکھتے ہیں: ''باوجود جنگ بہادر کی کوششوں کے عورتوں ہی کی مخالفت نے اس رسم ''ستی'' کو نیپال میں موقوف نہیں ہونے دیا۔(۴۶)

ہندومت کے بااثر حلقوں، مذہبی رہنماؤں اور خود عورتوں کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود ۱۸۲۹ء میں ''رسم ستی'' کی قانونی ممانعت کے بعد کیا ہندو سماج میں عورت کے مقام و مرتبے میں کچھ واضح فرق سامنے آیا اور کیا بیوہ عورت کا ہندو سماج میں مقام بلند ہوا، اسے کچھ حقوق نصیب ہوئے یا اس میں کچھ بہتری پیدا ہوئی؟ اس حوالے سے ڈاکٹر گستاوَلی بان لکھتے ہیں:

''اگر چہ بمشکل کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو اس کی ممانعت سے کوئی فائدہ ہوا، کیوں کہ ہندو سماج میں بیواؤں کی حالت جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، نہایت ہی دردناک ہے۔(۴۷)

شوہر کی موت کے ساتھ ہی عورت کے سامنے دو راستے رکھے جاتے تھے یا تو وہ اپنے شوہر کی چتا پر جل مرتی اور ''ستی'' کہلاتی یا ساری عمر دکھ بھگتتی، وہ بیوہ کا سر منڈوا دیتے تھے، وہ صرف صبح کے وقت روکھی سوکھی کھا سکتی تھی اور ہر وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے رہتی، لوگ اس کے سایے کو بھی منحوس سمجھتے تھے۔ انہی مصائب سے نجات پانے کے لیے موت کو زندگی پر ترجیح دے کر عورتیں ''ستی'' ہو جاتی تھیں۔

''ہندو بیوہ کبھی سماج میں سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس کا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا، اس کی نظر منحوس سمجھی جاتی ہے اور جس چیز کو وہ ہاتھ لگاتی ہے، وہ نجس سمجھی جاتی ہے، اس ذلت اور رسوائی کی زندگی پر وہ ستی ہو کر موت کو زندگی پر ترجیح دیتی اور نذر آتش ہو جاتی ہے۔(۴۸)

چناں چہ مذکورہ اسباب و وجوہات کے باعث ہندو سماج میں ''ستی'' کی رسم جاری ہوئی۔ مغل سلاطین کی پیہم کوششوں اور بعد ازاں برطانوی دور حکومت میں چار دسمبر ۱۸۲۹ء کو لارڈ ولیم ہنٹنگ نے بنگال میں جہاں ''ستی'' کی رسم پورے شد و مد سے جاری تھی، اس پر مکمل پابندی کا اعلان کیا، جسے شدت پسند حلقوں اور بنیاد پرست ہندوؤں نے عدالت میں چیلنج کر دیا۔ بالآخر معاملہ Privy Council انگلستان تک گیا۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ''ستی'' پر پابندی کی برقراری کے حق میں حتمی فیصلہ آیا، جس کے بعد ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی اسے نافذ العمل قرار دیا گیا۔ ان

تمام تر اقدامات کے باوجود ہندوستان کی بعض ریاستوں بالخصوص دیہی اور دور دراز علاقوں میں ''ستی'' کی یہ رسم پھر بھی جاری رہی اور آج کے مہذب اور متمدن دور میں بھی اس سے متعلق واقعات رپورٹ ہوتے رہتے ہیں۔

خلاصہ بحث

ہندوستانی تہذیب قدیم تاریخ سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ امتیاز بھی رکھتی ہے کہ اس تہذیب میں بیشمار رسوم ورواج پائے جاتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب ومعاشرت اور رسوم و رواج میں بعض ایسی رسومات بھی ہیں جنہیں ہندو دھرم، ہندومت میں تاریخی وتہذیبی اہمیت کے ساتھ ساتھ مذہبی اہمیت بھی حاصل رہی ہے۔ ایسی قدیم رسوم میں ''ستی'' کی رسم ہندوستانی تہذیب کا ہمیشہ سے حصہ رہی ہے بلاشبہ یہ قدیم رسم ہندو بیوہ عورتوں پر مذہب وسماج کے نام پر ہونے والا وہ بدترین ظلم ہے جو ہندومت کی تاریخ کا حصہ رہا گو کہ حکمرانی کے مختلف ادوار میں اس قبیح رسم پر پابندی اور قانونی قدغن بھی عائد کی گئی لیکن اس کے باوجود ''ستی'' کے واقعات رپورٹ ورونما ہوتے رہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی اس ظالمانہ اور غیر انسانی رسم کے شواہد وآثار ملتے ہیں۔ اس تحقیقی مضمون میں تاریخی حقائق، ہندومت کے مذہبی لٹریچر، ان کی تاریخ وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ وتجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ستی کی رسم کے حوالے سے اعداد وشمار بھی پیش کیے ہیں جن سے ہندوستانی معاشرے میں بیوہ عورتوں پر مذہبی ومعاشرتی اقدار کے نام پر روا رکھے جانیوالے امتیازی رویے اور بدترین مظالم کا پتہ چلتا ہے۔ ''ستی'' کی رسم کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ مضمون کا بنیادی موضوع ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ بیوہ عورتوں پر ہونے والا بدترین ظلم ہے جس کی انسانی تاریخ وتہذیب میں شاذ ونادر ہی مثال ملتی ہے۔ تہذیب وتمدن کے اس ترقی یافتہ دور میں ایسی قبیح رسم کا وقوع پزیر ہونا انتہائی شرمناک اور انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے۔ جس کا تدارک اور سدّ باب از حد ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر/ تاریخ اور عورت، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۴۶

۲۔ راجہ راجیسوراؤ اصغر/ ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۲۹۷

۳۔ ول ڈیورانٹ/ ہندوستان/ تاریخ، تہذیب، تمدن، فلسفہ، مترجم طیب رشید، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۶

۴۔ ودیانندگری/ ہندودھرم میں عورت کا مقام، بحوالہ: محسن عثمانی، ڈاکٹر/ ہندو مذہب، مطالعہ اور جائزہ، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ۲۰۰۵ء، ص ۲۷۲

۵۔ محمد شارق، حافظ/ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ، کراچی، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۴۔ ایضاً محمد شارق، حافظ / ہندومت۔ لاہور، کتاب محل، ۲۰۱۷۔ ص ۳۵۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۷۔ جلال پوری، علی عباس/ روایات تمدن قدیم، مطبوعہ جہلم پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۹

۸۔ محمد اشرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، مترجم قمر الدین، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۱

۹۔ Alteker. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu Civilization, Delhi, 1983, p.115,116

۱۰۔ ایضاً ص ۱۱۶

۱۱۔ ایضاً حوالہ سابقہ

۱۲۔ ایضاً ص ۱۲۷

۱۳۔ ایضاً ص ۱۲۲

۱۴۔ گوری شنکر، ہیراچند اوجھا/ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، مترجم منشی پریم چند، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۶۳

۱۵۔ Alteker. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu

Civilization,p126

۱۶۔ لیبان، ڈاکٹر/ تمدن ہند، مترجم سید علی بلگرامی، کراچی، بک لینڈ،۱۹۶۲ء، ص ۴۷۱

۱۷۔ ول ڈیورانٹ/ ہندوستان/ تاریخ، تہذیب، تمدن، فلسفہ، مترجم طیب رشید، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۶

۱۸۔ ایضاً حوالہ سابقہ ص ۱۲۶

۱۹۔ ایضاً ص ۱۲۶

۲۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر/ تاریخ اور عورت، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۴۶

۲۱۔ ایضاً ص ۴۷

۲۲۔ محمد اشرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، مترجم قمر الدین، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۲

۲۳۔ ابو الفضل/ آئین اکبری، لاہور، اردو سائنس بورڈ، جلد سوم، ص ۲۹۴

۲۴/ الف۔ محمد اشرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، مترجم قمر الدین، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۴

۲۴/ ب۔ Smith William Alfred,V.A/Oxford History Of India,1923,P:309

۲۵۔ Altekar. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu Civilization, Delhi, p.126

۲۶۔ لیبان، ڈاکٹر/ تمدن ہند ص ۴۷۰

۲۷۔ ایضاً ص ۴۷۱

۲۸۔ A.J.A Dubois/ Hindu Manners, Costoms & Cermonies, Oxford, 1960, p.353

۲۹۔ محمد اشرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، ص ۲۵۴

۳۰۔ ایضاً ص ۲۵۴۔۲۵۵

۳۱۔ لیبان، ڈاکٹر/ تمدن ہند، ص ۴۷۰

۳۲۔ محمد اشرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، ص ۲۵۶

۳۳۔ Altekar. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu Civilization, p.126

۳۴۔ لیبان، ڈاکٹر/تمدن ہند،ص ۴۷۰

۳۵۔ ابن بطوطہ/عجائب الاسفار، لاہور،۱۹۸۳ء،ص ۳۸۔۳۹

۳۶۔ عبداللہ یوسف علی/ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، لاہور،۱۹۹۴ء، دوست ایسوسی ایٹس، ص۲۳۴

۳۷۔ فرانسس برنیئر، ڈاکٹر /سفرنامۂ ہند، مترجم: خلیفہ محمد حسین، لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۰ ء،ص ۳۹۷،مزید دیکھیے: جلال پوری، علی عباس/ روایات تمدن قدیم ص۲۳۶

۳۸۔ محمد شرف، ڈاکٹر/ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں،ص ۲۵۷۔۲۵۸

۳۹۔ فرانسس برنیئر، ڈاکٹر/سفرنامۂ ہند،ص ۳۹۰۔عبداللہ فہد فلاحی/ تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں، لاہور،، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۷ء،ص ۵۰

۴۰۔ Alteker. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu Civilization, p.138

۴۱۔ ایضاً ص ۱۳۹

۴۲۔ ایضاً حوالہ سابقہ ص ۱۳۹

۴۳۔ عبداللہ یوسف علی/ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، دہلی ص ۲۳۵

۴۴۔ Alteker. A.S,Dr/ The Position of Women in Hindu Civilization, p.141

۴۵۔ لیبان، ڈاکٹر/تمدن ہند،ص ۴۷۰

۴۶۔ ایضاً حوالہ سابقہ،ص ۴۷۰

۴۷۔ ایضاً ص ۴۷۱

۴۸۔ گستاوَلی بان، ڈاکٹر/تمدن ہند،ص ۴۷۰

ڈاکٹر حافظ محمد ثانی بحیثیت صدر شعبہ قرآن وسنہ وڈائریکٹر سیرت چیئر وفاقی اردو یونیورسٹی، عبدالحق کیمپس، کراچی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عابدہ پروین بحیثیت ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ کراچی میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔